مجید امجد کی نظم

”آٹوگراف“ کا تجزیاتی مطالعہ

تحریر: پروفیسر شفیق الرحمٰن الہ آبادی
صدر شعبہ اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج میلسی

بیسویں صدی کے اوائل میں جنم لینے والے اور ترقی پسندوں کے ہاتھوں اپنی زندگی میں ٹھکرائے ہوئے مجید امجد کا شمار جدید اردو نظم کے اہم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ اداسی، تنہائی، گوشہ نشینی، قنوطیت، رجائیت، بے ثباتی، بے حاصلی، حیرت محرومی اور زندگی ان کی شاعری کے بنیادی موضوعات ہیں۔ جبکہ لسانیت وہیئت کے تجربے، موسیقیت وصوتیات، تشبیہات واستعارات اور علامت نگاری کو ان کی شاعری کے فنی محاسن قرار دیا جاسکتا ہے۔

زیرِ نظم ”آٹوگراف“ کا محرک کرکٹ کا وہ میچ ہے جو 1958ء میں ساہیوال اسٹیڈیم میں اس وقت کھیلا گیا جب فضل محمود پاکستان کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔ اتفاق سے مجید امجد بھی یہ میچ ملاحظہ کرنے کے لیے اسٹیڈیم میں موجود تھے تو انہوں نے خلافِ توقع ایک عجیب منظر دیکھا کہ نوجوان لڑکیاں کھلاڑیوں سے آٹوگراف لینے کے لیے کتنی بے چینی اور بے حیائی کا مظاہرہ کررہی ہیں۔

شاعر کی زبانی پہلا بند ملاحظہ فرمائیں:

کھلاڑیوں کے خودنوشت دستخط کے واسطے
کتابچے لیے ہوئے
کھڑی ہیں منتظر --- حسین لڑکیاں!
ڈھلکتے آنچلوں سے بے خبر، حسین لڑکیاں!

مذکورہ بند میں شاعر کا مشاہدہ عروج پر نظر آتا ہے۔ نظم کے آغاز میں ہی شاعر نے وہ فضا پیدا کردی ہے جو اپنے اندر حیرت، دلچسپی، حقیقت اور تجسس رکھتی ہے اور قاری **دوسرا بند** (جسے دوسرا منظر بھی کہا جاسکتا ہے) پڑھنے کے لیے بے قرار ہوجاتا ہے۔

مہیب پھاٹکوں کے ڈولتے کواڑ چیخ اٹھے
اُبل پڑے الجھتے بازوؤں، چٹختی پسلیوں کے پُر ہراس قافلے
گرے، بڑھے، مُڑے بھنور کے ہجوم کے

Scanned by CamScanner

مذکورہ دوسرے بند میں شاعر نے عمدہ منظر کشی کرتے ہوئے وہ منظر دکھایا ہے جب کرکٹ کے شائقین اسٹیڈیم کے آہنی دروازے کے کھلنے کے انتظار میں بے چین کھڑے ہوتے ہیں اور جب وہ اپنی مخصوص آواز سے کھلتا ہے تو لوگوں کا شور بھی اور ان کے ایک دوسرے کو دھکے دے کر اور گرا کر اندر داخل ہونے اور کرسیوں پر پہلی صف میں بیٹھنے کی آوازیں بھی بے ہنگم شور شرابے میں شامل ہو جاتی ہیں اور لوگ بے حسی اور بے مروتی سے ایک دوسرے کو کچل کر پہلی صف میں براجمان ہو کر بے حد دلی مسرت محسوس کرتے ہیں یہ سب کچھ وہ کھیل اور کھلاڑیوں کو دیکھنے کے لیے کرتے ہیں لیکن اگر ان لوگوں کو کسی ادبی تقریب میں مدعو کیا جائے تو اکثر کے پاس آنے کا وقت ہی نہیں ہوتا اور باقی لوگ شرکت کرنے کو غیر ضروری خیال کرتے ہوئے نظر انداز کر دیتے ہیں جبکہ میچ دیکھتے ہوئے وہ کھانا پینا تو کیا نماز تک فراموش کر دیتے ہیں۔

نظم کا تیسرا بند دیکھئے:

کھڑی ہیں یہ بھی، راستے پہ اک طرف

بیاضِ آرزو بہ کف

نظر نظر میں نارسا پرستشوں کی داستاں

لرز رہا ہے دم بدم

کمانِ ابرواں کا خم

شاعر نے نوجوانوں کی دھکم پیل دکھانے کے بعد لڑکیوں کا منظر دکھایا ہے کہ وہ کس بے تابی سے "بیاضِ آرزو بہ کف" آٹوگراف لینے کے لیے اپنی آنکھوں میں نارسائی کی داستاں اور حسرت لیے کھڑی ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر کھلاڑی نے انھیں آٹوگراف نہ دیا تو ان کی آرزوؤں کا خون ہو جائے گا۔ ان کے گھر سے لے کر کرکٹ کے میدان تک پہنچنے کی جدوجہد رائیگاں چلی جائے گی۔ "بیاضِ آرزو بہ کف" بڑی معنی خیز ترکیب ہے یعنی خواہشوں بھری کاپی (ڈائری) ہتھیلی میں پکڑ کر التجا کے انداز میں اور اپنے ابروؤں کو خم دے کر گویا عاجزی وانکساری کا پیکر بن کر وہ لڑکیاں کھلاڑیوں کے آگے سر تسلیم خم کیے آٹوگراف کی بھیک مانگ رہی ہیں گویا ان کی کوئی انا اور عزت نہیں ہے اور ایک کم پڑھے لکھے کھلاڑی جسے شاید آٹوگراف کا لفظی مطلب بھی نہ آتا ہو سے آٹوگراف لینے کے لیے کتنی بے قرار نظر آتی ہیں۔

چوتھا بند ملاحظہ فرمائیں:

کوئی جب ایک نازِ بے نیاز سے

کتابچوں پہ کھینچتا چلا گیا

حروفِ کج تراش کی لکیری

Scanned by CamScanner

تو تھم گئیں لبوں پہ مسکراہٹیں شریری

اس بند میں شاعر بیان کرتا ہے کہ جب لڑکیاں بڑی مشکل کے بعد کھلاڑی کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو وہ کھلاڑی تجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ بلکہ ڈرامہ کرتے ہوئے بے نیازی سے لڑکیوں کی بیاضوں پر حروفِ کج تراش کی صورت میں الٹے سیدھے اور ٹیڑھے میڑھے سے دستخط کرتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے شاعر نے نازِ بے نیاز اور حروفِ کج تراش ایسی نادر تراکیب استعمال کی ہیں جو اس کا (یعنی مجید امجد) کا طرۂ امتیاز ہیں۔ مسکراہٹیں کے ساتھ ساتھ لفظ شریر لگا کر شاعر نے لڑکیوں کی مسکراہٹ کو طنزیہ اور معنی خیز بنا دیا ہے۔

پانچواں اور چھٹا بند ملاحظہ فرمائیں:

کسی عظیم شخصیت کی تمکنت

حنائی انگلیوں میں کانپتے ورق پہ جھک گئی

تو زرنگار پلوؤں سے جھانکتی کلائیوں کی تیز نبض رک گئی

☆☆

وہ باؤلر ایک مہ وشوں کے جمگھٹوں میں گھر گیا

وہ صفحۂ بیاض پر بصد غرور کلک گوہریں پھری

حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیان وکٹ گری

مذکورہ بند میں شاعر بیان کرتا ہے کہ جب حسین و جمیل لڑکیاں ایک معمولی سے کرکٹر سے جب آٹوگراف لینے کے لیے اپنی بیاض حنائی انگلیوں سے کھول رہی تھیں تو ان کے خوبصورت لباسوں اور زرنگار پلوؤں سے نظر آنے والی کلائیوں کی تیز نبض ایسے محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ خوشی سے رک سی گئی ہو یا آٹوگراف ان کے نزدیک زندگی اور موت بنا ہوا تھا۔ یہاں شاعر جمال دوست کے روپ میں سامنے آیا ہے اس نے پہلے بند میں لڑکیوں کو حسین لڑکیاں کہہ کر مخاطب کیا ہے اور ان کے حسن و جمال کا اعتراف حنائی انگلیوں، زرنگار پلوؤں، مہ وشوں اور حسین کھلکھلاہٹوں ایسے مرکبات میں عیاں ہے۔

شاعر بیان کرتا ہے کہ وہ باؤلر جب خوبصورت لڑکیوں کے ہجوم میں گھر گیا تو وہ اپنے آپ کو ایک عظیم شخصیت تصور کرنے لگا اور لڑکیوں کی ڈائری کے صفحے پر بصد غرور دستخط کرنے لگا اور حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیان وکٹ گری۔ (یہ وکٹ شاعر کے دل کی بھی ہو سکتی ہے) شاعر کو یہ توقع تھی کہ کوئی لڑکی اس سے بھی آٹوگراف لے لیکن جب اس کی آس، یاس میں بدلتی ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں اس کا وجود بے مقصد ہے۔ بحیثیت شاعر اور دانشور اس کی کوئی اہمیت نہیں تو اس کا کرب اور خواہش **آخری بند** میں یوں سامنے آتی ہے:

Scanned by CamScanner

میں اجنبی، میں بے نشاں

میں پابہ گل!

نہ رفعتِ مقام ہے، نہ شہرتِ دوام ہے

یہ لوحِ دل، یہ لوحِ دل

نہ اس پہ کوئی نقش ہے، نہ اس پہ کوئی نام ہے

مذکورہ آخری بند میں شاعر کا دردوغم اور احساسِ محرومی اگرچہ مجسم ہو کر سامنے آجاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو شاعر، ادیب، دانشور اور فلسفی کہنے کی بجائے اجنبی، بے نشاں اور پابہ گل قرار دیتا ہے کیونکہ وہ بحیثیت شاعر معروف بھی تھے اور دانشور بھی لیکن جب اس کی بجائے کھلاڑی کو اہمیت دی گئی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ مجید امجد بھی دیگر تماشائیوں کی طرح خاموش رہتے ان کا تعلق ایک علمی خاندان سے تھا اور وہ نہ صرف ایڈیٹر تھے بلکہ ان کو جوش ملیح آبادی اور مصطفیٰ زیدی ایسے جید شعراء کرام کی معیت میں مشاعرے پڑھنے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ ان کا کلام اپنے عہد کے موقر ادبی جرائد مثلاً نیرنگِ خیال، شاہکار، مخزن، ہمایوں، ادبی دنیا اور اوراق میں شائع ہوتا رہا۔ ایسا پختہ اور استاد شاعر جب تعلیم یافتہ لڑکیوں کو لکھاری کی بجائے ایک کھلاڑی سے آٹوگراف لیتے ہوئے دیکھتا ہے تو اسے دلی افسوس ہوتا ہے اور ان کا یہ کرب مصنوعی نہیں حقیقی ہے وہ تمام عمر اپنے عہد کی کسی ادبی تنظیم کی بجائے اپنی شاعری کے ساتھ وابستہ رہے لیکن افسوس کہ لوگ انہیں پہچان نہیں پائے۔ انہیں وہ مقام نہیں دے سکے جس کے وہ مستحق تھے۔

میرزا ادیب نے بجا کہا تھا کہ:

"میں "آٹوگراف" کو اردو کی بہترین نظموں میں جگہ دیتا ہوں"۔

بقول احمد ندیم قاسمی:

"مجید امجد کا المیہ یہ ہے کہ لوگ اسے پہچان ہی نہیں پائے شاید اسی لیے وہ اپنی بے نظیر نظم "آٹوگراف" لکھنے پر مجبور ہوا حالاں کہ مجید امجد کو رفعتِ مقام بھی حاصل ہے اور شہرتِ دوام بھی۔ البتہ اس رفعت کا ادراک اور اس شہرت کے اعتراف میں دیر ہو رہی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ معمول کا شاعر نہیں تھا اس کے لہجے کے دھیمے پن میں بھی کاٹ ہے اس سے ہم مانوس نہیں ہیں اور اس کے طرزِ اظہار میں جو انوکھا پن ہے اس کے ہم عادی نہیں ہیں۔ وہ خود فریب نہیں تھا اس نے پوری دنیا کے لیے جو آئینے تراشے ان میں سب سے پہلے اپنا جائزہ لیا اور یہ تک کہنے سے باز نہ آیا کہ

Scanned by CamScanner

یہ لوحِ دل، یہ لوحِ دل

نہ اس پہ کوئی نقش ہے، نہ اس پہ کوئی نام ہے

مگر اہلِ ذوق کی لوحِ دل پر مجید امجد کا نام ہمیشہ کے لیے نقش ہو چکا ہے۔"

زیرِ نظر نظم فنی لحاظ سے بھی بہت اعلیٰ ہے۔ مفاعلن مفاعلن کے وزن پر لکھی گئی یہ نظم کل سات بندوں پر مشتمل ہے جس کی روانی اور تاثیر قاری کو متاثر کرتی ہے اس میں نایاب تراکیب کے علاوہ تکرارِ لفظی اور صنعت مراعاۃ النظیر کا بہت عمدہ استعمال نظر آتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ہماری معاشرتی ناہمواریوں، بدذوقیوں، ناانصافیوں اور جہالتوں کو موضوع بنایا ہے۔ یہ نظم صرف شاعر کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی ترجمان نہیں بلکہ ہر اس شخص اور لکھاری کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے جسے معاشرے میں وہ مقام نہیں مل رہا جس کا وہ مستحق ہے۔

بقول محسن بھوپالی:

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے

منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

اکثر ناقدین نے اس نظم کو شاعر کے احساسِ محرومی کا اظہاریہ قرار دیا ہے جبکہ مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجید امجد نے اس نظم میں ایک لکھاری اور کھلاڑی کا موازنہ کرنے کی کاوش کی ہے اور کھلاڑی کو لکھاری پر غالب دکھا کر لوگوں کی ادب سے عدم دلچسپی اور ان کی جہالت کا پردہ چاک کیا ہے اور ایک سوالیہ نشان چھوڑ دیا ہے کہ آپ بھی اپنی اداؤں پہ خود غور کریں کہ آپ کا ووٹ کس طرف ہے؟ کیا آپ کھلاڑی کو پسند کرتے ہیں یا لکھاری کو؟ کھلاڑیوں کے ہاتھ بلا (Bat) ہوتا ہے اور لکھاری کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے جو افراد کھیل کو پسند کرتے ہیں ممکن ہے ان کا آئیڈیل کوئی کھلاڑی ہو مگر جو افراد علم و ادب کے شعبے کو پسند کرتے ہیں ان کا آئیڈیل لکھاری یا ادیب ہوتا ہے۔

اس نظم میں حکمرانوں کے لیے بھی مجید امجد کا پیغام پوشیدہ ہے کہ وہ معاشرے میں علم کی روشنی دیکھنا چاہتے ہیں تو صاحبِ علم و دانش لوگوں کی قدر کریں جہاں وہ کرکٹ کے کھلاڑیوں کو لاکھوں روپے کے انعامات سے نوازتے ہیں اور ورلڈ کپ جیتنے والے کھلاڑیوں کے بلے اور گیندوں کی لاکھوں میں بولی لگتی ہے اور وہ عجائب گھروں کی زینت بنائے جاتے ہیں کیا انہوں نے مستحق لکھاریوں کے لیے بھی کبھی سوچا ہے؟ کیا انہوں نے لکھاریوں کی تخلیقات کو سرکاری طور پر زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کی کاوش کی ہے؟ اردو زبان ہماری بقا اور تہذیب و ثقافت کی شناخت ہے۔ وطنِ عزیز میں خانہ جنگی اور دہشت گردی کا خاتمہ علم و ادب کی بدولت ممکن ہے۔ اردو کو مکمل سرکاری، دفتری قومی اور تعلیمی زبان بنانے کی ضرورت ہے اگر چین والے چینی زبان پڑھ کر ترقی کر سکتے ہیں تو ہم پاکستانی اردو زبان پڑھ کر کیوں ترقی نہیں کر سکتے؟ اگر ہم لکھاریوں کی بجائے

Scanned by CamScanner

کھلاڑیوں کو اپنا آئیڈیل سمجھ کران سے آٹوگراف لیتے رہے تو ہماری نوجوان نسل کے ہاتھوں میں قلم کی بجائے بلا (Bat) ہوگا اور وہ لائبریری کی بجائے کھیل کے میدان میں جانا پسند کرے گی۔

مجید امجد نے اس نظم میں لڑکیوں کو بھی یہ پیغام دینے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ملکی ترقی میں خواتین کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ہیں انہیں وہ کام کرنے چاہئیں جو قابلِ رشک ہوں۔ ہمارے معاشرے میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔ ماں کی گود بچے کی اولین درس گاہ ہے اگر کوئی نوجوان لڑکی کرکٹ کا میچ دیکھنے جائے گی تو اس سے نہ صرف اس کے اہلِ خانہ بلکہ پوری قوم کا سر جھک جائے گا لڑکیوں کو چاہیے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو اس بلند مقام پر لے جائیں جہاں پر لوگ ان سے آٹوگراف لینے کے خواہش مند نظر آئیں۔

☆☆

تحریر: پروفیسر شفیق الرحمٰن الہ آبادی
صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج میلسی
0300-7725894

Scanned by CamScanner